Vol.5 No. 1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

مظفر وارثی کی غزل کا موضوعاتی تنوع اور فنی محاسن

i. محمد حسن فرید
ii. ڈاکٹر عائشہ سلیم
iii. راؤ محمد عمر

ABSTRACT
Muzaffar Warsi is one of the famous Urdu Naat poet but he has many shades of personality. He is simultaneously a Naat poet, poet nazim, lyricist, composer and critic. The echo of being a public poet is heard in his poetry. He created literature for the purpose of literature. That's why they have a variety of topics. When they see an oppression in the society, they become fans of the oppressed and participate in the protest through their poetry. He authored about twenty books. Wrote poetry collections such as "Bab Haram" and "Dil Se Dar -E- Nabi Tak" on praise and Naat recitation. In poetry, "Hisar" ," Zulm na sehna", "kamand," in lyric poetry, "The water of the stars" based on the fields of "Blood of green", while in ghazal writing, "Baraf ki Naoo" , "Raakh ke Dheer me phool", "Tanha Tanha Guzri hai" And " Dehka Jo Teer kha ke "are his poetry collections. He also wrote an autobiography entitled "Trace of the two gone". During Zia-ul-Haq's tenure, he was awarded with the Presidential Medal for Excellence.
Keywords: Muzaffer Warsi, Pakistani, Poet, Ghazal, Criticism, Patriot.

مظفر وارثی کی غزل میں مذہبی موضوعات سے لے کر سیاسی، سماجی، معاشی اور تصور حسن و عشق جیسے سبھی موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مظفر وارثی کی پیش کردہ غزلیات عقل و دانش کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔ محمد سعید اللہ صدیق مظفر وارثی کے متعلق لکھتے ہیں:

"مظفر وارثی دنیائے سخن کا ایک معتبر نام ہے۔ حمد ہو یا نعت، غزل ہو یا نظم، گیت ہو یا قطعات، ہر صنفِ سخن میں انہوں نے اپنے فن کا لوہا منوایا ہے۔۔۔۔ان کی شاعری میں فکر اور سوچ تمام تر رنگوں میں عیاں ہیں۔۔۔" [1]

مظفر وارثی کی غزلیات میں ہمیں درج ذیل موضوعات ملتے ہیں:

1۔ تصورِ خودی:

انسان پیدائشی طور پر آزاد پیدا کیا گیا ہے اور کسی کے ماتحت نہیں۔ دنیا میں جینے کے لئے انسان نے خود غلامی کا طوق اپنے گلے میں سجا رکھا ہے۔ اپنی زندگی کو پر آسائش بنانے کے لیے لوگ دست دراز کرنا اعزاز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ عزتِ نفس اور انسان کی خودداری سب سے زیادہ سوال کرنے سے مجروح ہوتی ہے۔ مظفر وارثی کی غزلیات بھی اسی تصورِ خودی اور خود شناسی کی مظہر ہیں۔ ان کے ہاں محنت کی اجرت مانگنے کے لیے بھی ہاتھ کسی کے آگے پھیلانا شرفِ انسانی کے برخلاف ہے۔ مانگے ہوئے سائے کی بجائے دھوپ کی حدت و شدت قبول ہے۔ پاؤں جب سلامت ہوں تو پھر بیساکھیوں کا سہارا لینے کی بجائے خود اپنے پاؤں پر چل کر منزل تک پہنچنا چاہئے۔ مگر جب مظفر وارثی دیکھتے ہیں کہ لوگ سوال کرنا اپنے لیے تحقیر کی بجائے اعزاز کا باعث سمجھتے ہیں تو طنزیہ اور احتجاجی لہجے میں کہتے ہیں:

ے لوگ غیرت کی پرورش کے لئے
کر رہے ہیں وصول امدادیں

ے ہاتھ پھیلانے کے آداب سے ناواقف ہیں
ہم سے محنت کی بھی اجرت نہیں مانگی جاتی

ے جب پاؤں سلامت ہیں بیساکھیاں پھر کیسی
بالشتوں بونوں سے کیا قامت و قد لینا

ہمارا سماج اس قدر مادیت پرستی کا شکار ہو چکا ہے کہ ہوش و حواس تو اس کے بیدار ہیں مگر ضمیر سو یا پڑا ہے اپنی جان کے تحفظ کے لیے اپنی عزت اور وقار تک داؤ پر لگا دیا جاتا ہے:

ے ذلت کے بھاؤ بک گئیں عزت مآبیاں
دستار اس کی جاتی رہی سر نہیں گیا

انسان فطری طور پر حریت لے کر پیدا تو ہوتا ہے مگر بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی حریت، آزادہ، عزت نفس اور خودداری کو تادمِ مرگ قائم رکھتے ہیں۔ اکثر لوگ چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں جہاں پیسے نے اپنی چمک دکھائی اسی طرف چل دیے۔ یہ شرفِ انسانی اور اس کے وقار و منصب کے لیے موزوں نہیں۔ خوددار آدمی اپنا موقف بدلتا نہیں۔ اگر اسے اپنے موقف میں خسارہ ہی اٹھانا پڑے تب بھی وہ کسی کے کہنے پر اپنے مدعا سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے اپنے پاؤں کاٹنا تو گوارا ہوتا ہے مگر کسی کے اشاروں پر چلنا قبول نہیں:

---

i. ایم فِل سکالر، شعبہ زبان و ادبیاتِ اردو، جامعہ پنجاب لاہور۔
ii. اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی لاہور۔
iii. وزٹینگ فیکلٹی، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

پاؤں اپنے کاٹ ڈالوں گا خود اپنے ہاتھ سے
مجھ کو دنیا کے اشاروں پر اگر چلنا پڑا

2۔تصورِ وقت:

وقت کسی کا رفیق نہیں۔اس نے بڑی بڑی سلطنتوں اور دارا و سکندر جیسے حکمرانوں کو پچھاڑ دیا۔ وقت کی بنیادی خاصیت ہے کہ اس میں ٹھہراؤ نہیں بلکہ یہ مسلسل اپنے دھارے میں بہتا چلا جارہا ہے۔ ہمارا حال لحظہ بہ لحظہ ماضی کا حصہ بنتا جارہا ہے۔ وقت کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا ہے۔ کامیاب وہی لوگ ہیں جو وقت کے ہم قدم چلنا سیکھ جاتے ہیں:

وقت کے ساتھ چلا کرتے ہیں قسمت والے
وہ صدا دیتا ہر ایک در سے گزر جاتا ہے

عربی مقولہ ہے "الوقت السیف" کہ وقت ایک تلوار ہے جو ہر ایک شے کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ وقت کے پاس بھی اس قدر صلاحیت نہیں کہ وہ دوبارہ آپ کو وقت دے سکے۔ اسی تصور کی طرف مظفر وارثی اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وقت پہر کی صورت میں آواز دیتا ہے۔ صبح سے دوپہر، دوپہر سے سہ پہر، سہ پہر سے شام اور شام سے بلآخر رات۔ وقت اپنے ہونے اور بدلنے کا فقط اعلان کرتا ہے جب کہ یہ بھی کسی کے لئے رکا نہیں۔ اگر ہم وقت سے قرضِ تعاون کے خواہاں ہوں کہ آج کا کام کل پر چھوڑتے ہیں تو تنزلی کی بنیاد گویا ہم خود اپنے ہاتھوں سے رکھ رہے ہیں۔ پھر شکست خوردہ ہو کر ہمیں قسمت کا شاکی ہونے کی بجائے اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہرانا چاہیے:

وقت سے ہم نے قرضِ تعاون لیا
زندگی نے دکھوں کے لیے چن لیا

اگر وقت کے ہاتھ سے نکل جانے پر ہمیں ملال نہیں تو پھر آنے والا کل بھی ہمارے لئے کوئی مژدہ لے کر نہیں آ سکتا:

فردا بھی کیوں کرے گا مظفر ہمیں معاف
صدیوں کے ضائع ہونے کا غم آج بھی نہیں

اگر وقت کی مہار ایک بار ہاتھ سے نکل جائے تو پھر دوبارہ اسے اپنی دسترس میں کرنا مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہے۔ جو وقت کے ساتھ نہیں چل سکتے وہ بعد از جتنی بھی جدوجہد کر لیں اور وقت کے تعاقب میں پوری جان لڑا دیں، وقت کو اپنے اختیار میں نہیں کر سکتے:

ساتھ نہ دینے والا وقت کے پیچھے بھاگنے والا
ہاتھ نہ آنے والی بانہیں کھینچے پھرتا ہے

اس کے برعکس اگر وقت کے ایک ایک لمحے کی قدر و قیمت کا احساس ہو جائے تو پھر ایک وقت ہی نہیں، بلکہ سارے زمانوں پر اپنی حکومت کا سکہ جمایا جا سکتا ہے:

جمع کرتے رہو لمحہ لمحہ
کبھی دامن میں زمانے ہوں گے

3۔فن برائے قومی احساسات:

مظفر وارثی ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اس حوالے سے وہ اپنی آپ بیتی "گئے دنوں کا سراغ" میں بھی رقم طراز ہیں کہ شاعر یا ادیب فی الحقیقت وہی ہو سکتا ہے جو اپنے عہد کا پورا شعور رکھتا ہو۔ تبھی وہ زندگی اور سماج کی اصل معنوں میں ترجمانی کر سکتا ہے۔ ہر دور میں ادب کے تقاضے اور ادیب کے فرائض بدلتے ہیں۔ قلمکار محض ایک عہد کا ترجمان نہیں ہوتا، بلکہ اس کا اولین فریضہ ماضی، حال اور مستقبل میں رشتہ جوڑنا ہوتا ہے۔ سچ لکھنے والے سے بڑا ترقی پسند کوئی نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایک فن کار کو اپنے فن کے ذریعے معاشرے کی آواز بلند کرنی چاہیے۔ مظفر وارثی اس متعلق اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

"جو شاعر بدلے ہوئے ماحول کے ساتھ نہیں چل سکتے، ان کی تخلیقات اپاہج ہو جاتی ہیں۔ قلم کار کا اولین فریضہ ماضی، حال اور مستقبل میں رشتہ جوڑنا ہوتا ہے۔" ۲

تخلیق کے لہجے میں کرے بات سخنور
آواز کسی طور تو فنکار اٹھائے

حقیقی فنکار وہی ہے جو معاشرتی دکھ کو اپنا دکھ اور معاشرتی خوشی کو اپنی خوشی متصور کرتا ہے ایک ادیب اپنی منشا سے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے سر دار جانے سے بھی گریز نہیں کرتا:

میری گردن میں ہر ایک کا طوق ہے یہ میرا شوق ہے
اپنی ہر سانس میں ہر دکھی شخص کے دکھ پروتا ہوں میں

داعیانِ حق کے لیے روزِ ازل ہی سے مشکلات آڑے رہی ہیں۔ کبھی مذہبی سطح پر تو کبھی اخلاقی سطح پر، کبھی سیاسی سطح پر تو کبھی طبقاتی سطح پر، ہر ممکن کوشش کے ذریعے حق بات کہنے سے باز رہنے کا کہا گیا۔ مگر ایک اچھا ادیب کبھی بھی اپنی قلم اور فن کے ساتھ غداری نہیں کرتا۔ مظفر وارثی کہتے ہیں کہ اگر ادب کے میدان میں وارد ہو ہی گئے ہیں تو پھر ناموسِ قلم کو ہر صورت برقرار رکھنا ازبس ضروری ہے:

؎ سچ حوصلہ دے جائے یادار پہ لے جائے
منصب ہے مظفر کا ناموسِ قلم رکھنا

ایک ہنر وریا فن کار کو شجرِ ثمر دار ہونا چاہیے۔ جو پتھر جہاں والوں کی طرف سے اچھالے جانے کے باوجود بھی انہیں پھل مہیا کرے ایک ادیب وار کرنے کی بجائے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بدلے میں دعا لوٹائے:

؎ ہنر وروں کی طرف سنگ آتے رہتے ہیں
جواب دو تو دعا دینا وار مت کرنا

4۔ عقل و جنوں کا موازنہ:

اردو شاعری کی روایت میں جنوں کو عقل پر فوقیت دی گئی ہے۔ مظفر وارثی کے ہاں بھی ہمیں یہی تصور ملتا ہے۔ جب فیصلے دل کے ہوں تو پھر خرد سے مشاورت نہیں کی جاتی۔ عشق و جنوں کا فیصلہ روزِ ازل سے یکطرفہ رہا ہے:

؎ وفا رقیب کی باتیں نہیں سنا کرتی
جنوں خرد کے مقالے نہیں پڑھا کرتا

؎ دل کے بارے میں ہم عقل سے کچھ نہیں پوچھا کرتے
عقل بہت ہی سنجیدہ دیوانی ہوتی ہے

5۔ تصورِ جمہوریت:

مظفر وارثی جمہوری نظام کے خلاف تھے۔ ان کے مطابق جمہوری نظام کے ذریعے کٹھ پتلی حکومت عوام پر مسلط کی جاتی ہے۔ جمہوریت کی بجائے وہ مصطفوی انقلاب کے حق میں تھے اس غرض سے انہوں نے طاہر القادری کی تحریک میں بھی شمولیت اختیار کی۔ مگر جلد ہی حقائق واضح ہونے پر اسے خیر آباد کہہ دیا۔ مظفر وارثی جمہوری رائے کو بھیک قرار دیتے ہیں جسے حاصل کر کے اربابِ حکومت اقتدار میں آتے ہیں:

؎ یہ سلطنت ملی ہے اسے رائے مانگ کر
اس کو امیرِ شہر بھی خیرات نے کیا

جمہوری نظام میں حکومت کا تاج ایسے لوگوں کے سر سجا دیا جاتا ہے جو کہ اس کے اہل نہیں ہوتے۔ نتیجتاً نظام میں بگاڑ پیدا کر کے پہلے سے بھی زیادہ ملکی خزانے کو کنگال کر جاتے ہیں۔ بقول شہزاد احمد:

"اس میں عوامی شاعر بننے کی پوری پوری صلاحیت ہے۔ اسے ملک کی ٹھوس سیاسی صورتحال کا ادراک ہے اور عوام کے شعور کو پوری طرح بیدار کرنے کا اہل ہے" ۳؎

؎ نہیں نہیں کوئی بھی قد آور نہیں ہے ان میں
سروں کو اونچی کُلاہ میں دے دیا گیا ہے

جمہوریت کا نظام عوام کو لوٹنے اور ان سے دھوکہ کرنے کا ایک بہترین ہتھیار ہے جمہوری نظام میں ووٹ کے مطالبے سے قبل سیاستدان عوام میں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ان کے غم کو اپنا غم اور ان کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھتے ہیں۔ عوام کی بولی بول کر ان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی عوامی نظریات کی ترجمانی در حقیقت انہیں زمانے میں ایک انقلابی شخصیت کے طور پر سامنے لاتی ہے۔ مگر جب وہ اقتدار میں آجاتے ہیں تو اسی عوامی سوچ کی تردید کے لئے نئے طریقے وضع کرتے ہیں۔ کبھی فلسفے کے ذریعے تو کبھی ظلم و تشدد کے ذریعے۔ وہی خیالات جس کی بدولت حکومت ملی بعد از انہیں تصورات اور خیالات کے علمبرداروں کو باغی ٹھہراتے ہیں:

؎ تنقید کر رہا ہے وہی میرے ذہن پر
جس کو حسین میرے خیالات نے کیا

6۔ ہجرت کا المیہ:

مظفر وارثی کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جو ہجرت کے المناک حادثے سے گزرے۔ یہ قیامِ پاکستان سے قبل ہندوستان کے علاقے میرٹھ میں رہتے تھے۔ اپنے وطن کے حصول کے لیے کئی حسین خواب پلکوں میں سجائے گئے۔ مگر یہ اندازہ تک نہ تھا کہ حسین خواب کی تعبیر اس قدر بھیانک ہو گی:

؎ بڑھا دی گئی اور بھی پیاس میری
میں اچھا تھا دامن بھگونے سے پہلے

؎ آج ہمارے انجاموں پر کتنی اداسی چھائی ہے
ہم نے کیسا کیسا شور مچایا تھا آغازوں پر

مظفر وارثی مہاجرین کا دکھ درد محسوس کرتے ہوئے اپنے وطن میں آکر پر ملال نظر آتے ہیں۔ وہ جب اپنے وطن میں بھی بے چینی اور بے سکونی کا عالم دیکھتے ہیں تو غور و تفکر کرتے ہیں کہ

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

آخر ہم نے یہ ساحل کیونکر پار کیا۔ وہ اپنے آبائی علاقے میرٹھ کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں مگر جغرافیائی تقسیم انہیں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیتی:

ے دوسرے ساحل پہ آکر ہم سوچ رہے ہیں
ہم نے آخر کیوں یہ دریا پار کیا تھا

ے جغرافیے نے کاٹ لیے راستے میرے
تاریخ کو گلہ ہے میں گھر نہیں گیا

قیام پاکستان سے قبل لوگ غیروں سے لٹ رہے تھے۔ جب کہ قیام پاکستان کے بعد ہمیں اپنوں نے لوٹا۔ انہیں طغیانیوں سے نکالا تو گیا مگر بدلے میں کنارے پر لا کر ڈبو دیا گیا:

ے نکالا گیا مجھ کو طغیانیوں سے
کنارے پہ لا کے ڈبونے سے پہلے

مظفر وارثی ہجرت کے بعد پیش آنے والے استحکام کے مسائل کو نہ صرف بیان کرتے ہیں بلکہ اس کے ذمہ داران رہبروں کو ٹھہراتے ہیں جن کی قیادت میں ہم نے سفر کا آغاز کیا۔ طغیانیوں سے گزر کر مہاجرین کنارے تک تو آنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر یہ کیا خبر تھی کہ ساحل ہی ان سے وفاداری نہیں کریں گے:

ے ساری طغیانیوں سے گزرتے رہے پار اترتے رہے
ساحلوں نے بھی ایک دن ڈبونا ہی تھا یہ تو ہونا ہی تھا

ے ناخداؤں کے تدبر نے ڈبویا ہے مجھے
ورنہ کشتی میری ساحل پہ بھنور لے آتا

رہزنوں کے چنگل سے تو ہم نے آزادی حاصل کر لی مگر بدلے میں ہمارے رہبروں نے ہی ہمیں ہتھیا کر اپنا غلام بنا لیا۔ وہ دریچہ جو تازہ ہواؤں کے جھونکے کے لئے تشکیل پایا تھا اب دکھوں کی رہ گزر ہے۔

7۔ نظام عدلیہ و قانون سازی پہ طنز:

مظفر وارثی کی غزلیات کے ہر مجموعے میں عدلیہ کو حقیقت کا آئینہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ عدل کو جرم کی داشتہ قرار دیتے ہیں۔ ایک غریب ساری عمر عدالتوں کے چکر کاٹتے کاٹتے گزار دیتا ہے مگر اسے انصاف نہیں ملتا، اس کے برعکس مجرم جواز عدل خرید لیتے ہیں اور یوں لٹیرا بھی احتسابی بن کر سامنے آتا ہے:

ے عدل کو چھوڑ کر عدلیہ
جرم کی داشتہ ہو گئی

ے سیاہی پھیر دو سب آئینوں پر
لٹیرا احتسابی ہو گیا

ہمارے ہاں صلیبیں ترازوؤں کی طرح گڑی ہوئی ہیں جس میں طاقت والا اپنی مرضی کے مطابق عدل تولتا ہے:

ے جوازِ عدل بھی مجرم خرید لیتے ہیں
گڑی ہوئی ہیں صلیبیں ترازوؤں کی طرح

بات یہاں تک جا پہنچی ہے کہ عدالت میں بیٹھے منصف بھی آزادی سے فیصلہ نہیں کر پاتے۔ وہ مجرم کی حراست میں آ کر حق فیصلہ کرنے سے دبک جاتے ہیں اور کوئی قانون بھی اپنے سچے ہونے کو ثابت نہیں کر پاتا:

ے منصف ہیں عدالت میں مجرم کی حراست میں
خود اپنی وکالت بھی قانون نہیں کرتے

جب عدلیہ سے مظفر وارثی ایک خونی کو انصاف کے ساتھ بری ہوتا دیکھتے ہیں اور جرم نہ کرنے والوں کے تعاقب میں عادل پاتے ہیں تو احتجاجی انداز میں کہتے ہیں:

ے عدالتیں نہیں قانون کی دکانیں ہیں
بکے بغیر بیانات کون دیتا ہے

ے جو منصفوں کے جرائم کی بات کی میں نے
عدالتوں سے صدا آئی یار چپ ہو جا

امیروں کو گھروں سے بلا کر انصاف پیش کیا جاتا ہے جبکہ غریبوں کی فریادیں قہقہوں میں اڑا دی جاتی ہیں:

ے قہقہوں میں اڑائی فریادیں
اور ہم کو عدالتیں کیا دیں

فی الحقیقت جرم مجرم نہیں بلکہ عدالتی کر رہی ہیں کیوں کہ وہ طاقتور مجرم کی پشت پناہی کرتے ہوئے اسے بری کر دیتے ہیں۔ یہاں قرآن پہ ہاتھ رکھ کر بیانات بیچے جاتے ہیں۔ جو اس نظام

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کے خلاف سچی آواز بلند کرے اس کی آواز باغیانہ قرار دی جاتی ہے۔ عدالتیں بھی در حقیقت ظالم لوگوں کے فیصلوں کی پابند ہیں اور اسی ارادے کا نام قانون ہے۔ عدالت کا انصاف اس قدر سچا ہوتا ہے کہ بری ہونے والے سب مجرم اقبالی ہوتے ہیں۔

8۔ سماجی ملمع سازی:

ہمارے سماج کے ہر شخص نے اپنے چہرے پر نقاب ڈال رکھا ہے۔ کوئی بھی فرد اپنی حقیقی صورت اور سیرت کی پیشکش کے لئے کوشاں نہیں ہے۔ ہم انفرادی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے معاشرے کو اس کا دوش دیتے ہیں کہ معاشرہ برا ہے۔ تبھی جرم دن بدن بڑھ رہا ہے۔ ایسی صورت میں مظفر وارثی استفہامی انداز میں جواب دیتے ہیں:

ے معاشرہ ہے مظفر قصور وار اگر
وہ کون ہے جو اسے بے لگام کرتا ہے
ے کسی بھی چہرے پہ اصلیتوں کے داغ نہیں
کہ لوگ روپ بدلتے ہیں پہلوؤں کی طرح

ہم معاشرے کو تو سدھرا ہوا دیکھنے کے خواہ ہیں مگر اپنے آپ کو سنوارنا ہمیں گوارا نہیں۔ دوسروں کی برائیوں سے تو بخوبی واقف ہیں مگر اپنی برائیوں پر ہماری نظر نہیں پڑتی۔ مرزا ادیب مظفر وارثی کے غزلیات میں پیش کردہ اس تصور کے متعلق کہتے ہیں:

"مظفر وارثی کے کلام میں جدید معاشرے کے اندر کا تضاد اور دہرے میعار کا ادراک قدم قدم پر دکھائی دیتا ہے۔ اور انہوں نے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر اپنے مشاہدے کو پھیلا کر اپنے تجربات کے حسین سانچے میں ڈھالا ہے۔"[۴]

ے اوروں کے خیالات کی لیتے ہیں تلاشی
اور اپنے گریباں میں جھانکا نہیں جاتا
ے اوروں کو دوش دینا پرانا رواج ہے
ہم آپ ہی برے تھے زمانہ برا نہ تھا

دراصل لوگوں کے آپس کے معاملات، تعلقات اور باہمی عمل اور رد عمل کا نام ہی معاشرہ ہے۔ معاشرہ افراد اور ان کے افعال سے تشکیل پاتا ہے۔ معاشرہ تبھی سنورے گا جب ہم سنوریں گے۔ ہمیں اجتماعی ترقی دیکھنے کے لئے انفرادی جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم جرم کی کثرت کو اپنے لئے حلت کا جواز سمجھتے ہیں، پورا زمانہ یہ کر رہا ہے لہذا میرے نہ کرنے سے کیا فرق پڑے گا زمانے کو؟ دراصل یہی تصور ہماری تنزلی کی بڑی وجہ ہے اگر مصلح بھی یہی نظریہ اپنالیں کہ ہماری کوشش کا جب حاصل ہی کچھ نہیں تو پھر جدوجہد کرنا بے سود ہے۔ یوں معاشرہ مزید زوال کا شکار ہو گا۔ ہم یہ نہ دیکھیں کہ اس نے معاشرے کے لیے کیا کردار ادا کیا ہے جو میں کروں، بلکہ ہمیں اس طرح اپنے آپ کا محاسبہ کرنا چاہیے کہ میں نے انفرادی طور پر اس کے لیے کیا کردار ادا کیا۔ میں نے اس کی ترقی میں کتنا حصہ ڈالا ہے؟ جب سماج کا ہر فرد انفرادی طور پر اپنے آپ کا محاسب ہو گا تبھی معاشرہ ترقی پائے گا۔

9۔ رجائیت پسندی:

مظفر وارثی کی غزلیات میں امید پسندی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ معاشرتی تلخیوں کا زہر چاٹتے ہیں۔ مگر پھر بھی بد دل اور ناامید نہیں ہوتے۔ وہ خدا اور مخلوق خدا سے مشکلات کے بعد آسانیاں ملنے کی امید رکھتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کے تیسویں پارہ میں بھی ذکر ہوا: ان مع العسر یسرا بے شک تنگی کے ساتھ آسانی ہے:

ے کبھی خدا سے مظفر نہیں ہوا مایوس
یہ سنگ کھا کے ثمر کی طرف بھی جاتا ہے
ے بدل نہ ہو یا چاہنے والوں کا شہر ہے
مر تو نہیں گئی ہے وفا اور دیکھ لے

مظفر وارثی کے مطابق زندگی فی الحقیقت شعلہ و شبنم کے سنگم کے سفر کا نام ہے۔ جس میں دھوپ کی اپنی جگہ حرارت جبکہ چاندنی کی اپنی اہمیت ہے۔ آپ کی شاعری مسلسل جدوجہد پر امید استوار رکھنے کا درس دیتی ہے۔ ہمیں اپنے سے مکمل کوشش کرنی چاہیے بقیہ اس کا نتیجہ قسمت کے ذمہ ہے۔ لہذا کامیابی کا پہلا زینہ امید استوار کرنا اور اپنے آپ سے اس کام کے کرنے پر یقین رکھنا ہے۔ اگر مشکلات میں دل برداشتہ ہو کر اپنے مدعا یا مقصد سے رجوع کر لیا جائے تو کامیابی کبھی مقدر نہیں بن سکتی۔ اسی صورت میں کامیابی ممکن ہے کہ ہم اپنے سے دیا جلا کے رکھیں۔ بقیہ خدا جانے اور ہوا جانے:

ے خود سے چراغِ دل نہ بجھا اور دیکھ لے
کرتی ہے کیا سلوک ہوا اور دیکھ لے

10۔ حب الوطنی:

وطن سے محبت ایمان کا جزو ہے۔ گھر کی قدر بے گھروں سے پوچھیے۔ جو سارا سال اپنے دوش پر اپنے ٹھکانے اٹھائے پھرتے ہیں۔ مظفر وارثی ملکی حوالے سے اگرچہ شکوے کرتے بھی نظر آتے ہیں مگر یہ شکوے اپنے وطن سے نہیں بلکہ اس وطن کے امراء سے ہیں جو غریبوں کو لوٹ کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ جہاں تک وطن سے محبت کا تعلق ہے تو مظفر وارثی کی اس سے وابستگی کچھ یوں سامنے آتی ہے:

؎مظفر اپنی زمین پاؤں نے نہیں چھوڑی
اگرچہ شہر میں پانی کمر تک آیا ہے
؎ٹوٹ کر پیار وطن سے کرنا
ورنہ کاندھوں پہ ٹھکانے ہوں گے

مظفر وارثی اپنے وطن میں خوشیوں کی سحر لانے کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے کے لئے تیار نظر آتے ہیں:

؎مظفر اپنے وطن کی کسی سحر کے لئے
اگر شفق نہ ملی اپنا خون مل دوں گا

11۔ جدیدیت کا تصور:

جو وقت اور زمانے کے ساتھ چل سکے زمانہ اسی کا ہوتا ہے۔ ہر زمانے کے اپنے مطالبات اور تقاضے ہوتے ہیں جن کے لیے اپنی قدیم روایات کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ مظفر وارثی بھی اسی تصور کی پیشکش کرتے ہیں کہ اگر ہم نے نئے زمانے میں رہتے ہوئے بھی پرانے انداز اپنائے تو ترقی کے سفر میں ہم سب سے پیچھے رہ جائیں گے:

؎نئی دنیا نہ قبولے گی ہمیں
اگر انداز پرانے ہوں گے
؎اوڑھ بھی لے وہ جسم نیا تو کیا حاصل
روح مظفر جس کے ساتھ پرانی ہے

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم اپنی اولاد کی تربیت اپنے زمانی تقاضوں کے مطابق نہیں بلکہ ان کے زمانی تقاضوں کے مطابق کرو۔ وہ تمہارے زمانے کے لیے پیدا نہیں کیے گئے بلکہ اپنا نیا زمانہ لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ تم اپنی زندگی گزار چکے، جب کہ انہوں نے نئے زمانے میں زندگی بسر کرنی ہے۔ مظفر وارثی بھی اسی نظریہ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہاری اولاد در حقیقت تمہارا فرادیعنی آنے والا کل ہے۔ اس کا احترام تم پر لازم ہے۔ آنے والے کل کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے بچوں کی تربیت کرو گے تو کل یہ تمہارا نام روشن کریں گے:

؎اپنے فردکا احترام کرو
مار دو ورنہ اپنی اولادیں

12۔ آمریت:

مظفر وارثی نے مارشل لاء کی صعوبتیں بھی اپنی زندگی میں جھیلیں۔ مارشل لاء میں اختلاف رائے کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور عوام کو آمر کے ہر حکم پر سمعنا واطعنا کی مہر ثبت کرنا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مظفر وارثی نظام آمریت کے بھی خلاف تھے کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی میں یہ بخوبی دیکھ لیا کہ ایک آمر کسی طور پر بھی عوام کی مسیحائی نہیں کر سکتا۔ اس کی ابتدا بھی اختلاف رائے کے بکنے سے ہے جو کہ ظلم کے مماثل ہے:

؎اختلاف رائے بکنے لگ گیا
آمریت حکمران بنتی گئی

13۔ حق پرستی:

ایک ادیب کا کام ہر حال میں سچ کہنا ہے۔ خواہ وہ اس کے خلاف ہو یا کسی اور کے بر خلاف۔ مظفر وارثی کی شاعری زندگی اور سماج کے مد مقابل کھڑی ہے۔ ان کی شاعری حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی تلخیوں کو اپنے رگ و روپ میں اتارتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں جابجا نوائے حق کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ چاہے مذہب میں رواج دی گئیں باطل روایات ہوں یا سیاست کی بد اعمالیاں، ان کی غزل ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ اپنے اچھے مستقبل کے خواب کی تشکیل کے لئے یہ حادثات زمانہ سے بھی ٹکرانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں:

؎کتراؤں حادثاتِ زمانہ سے کس لئے
جب زندگی کو کر دیا مستقبلوں کے نام

آپ نجات کے رستے کی بڑی علامت بھی یہی قرار دیتے ہیں کہ اس کا مسافر کوئی عام آدمی نہیں بن سکتا۔ جس پر قدم کانپیں چلتے ہوئے، در حقیقت وہی نجات کا راستہ ہے:

؎جس پہ چلتے ہوئے قدم کانپیں
بس وہی رہگزر نجات کی ہے

حق پرست اس دنیا سے رخصت بھی ہو جائے تو وہ لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے:

؎تیز ہوا پر شعلہء حق لکھنے والا
صدیوں کے اعمال میں زندہ رہتا ہے

مگر جب زمانے کی بزدلی اور دوغلے پن کا مشاہدہ کرتے ہیں تو طنزیہ انداز اپناتے ہوئے اپنے غم و غصے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

؎سچائیوں سے آنکھ ملانے کا حوصلہ

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کل بھی نہ تھا خدا کی قسم آج بھی نہیں

14۔لاحاصلیت:

دور حاضر میں ہر شخص ترقی کا خواہش مند تو ہے مگر عملی طور پر کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں۔لوگوں کی حرکت تو تیز سے بھی تیز تر ہے مگر سفر منزل پھر بھی آہستہ ہے۔زندگی کا سفر گویا ہمارا لاحاصلیت پر مبنی ہے۔ہم مسلسل سفر تو کر رہے ہیں مگر ہم نے اپنی منزل کا تعین ابھی تک نہیں کیا۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ترقی کرنے کے باوجود بھی ہم اپنے ایک ہی محور میں میں کولہو کے بیل کی مانند گردش کر رہے ہیں:

؎کوئی بھی سیدھی سمت میں جاتا نہیں دکھائی دیتا

جانے کس کی کون مہاریں کھینچے پھرتا ہے

قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک ہم مسلسل لاحاصلیت کا سفر ہی طے کر رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس قوم کی حالت بہتر کی بجائے دن بدن بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

15۔سماجی ناہمواری:

مظفر وارثی معاشرتی افراتفری کو دیکھ سماج پر ہی سوال اٹھاتے نظر آتے ہیں:

؎اپنے خون میں لوگ نہائے پھرتے ہیں

کیا ان آبادیوں میں ساون نہیں ہوتا

اس قبرستانی بستی میں جو شخص بھی زندہ ہے وہ اپنے حصے کی لاشیں کھینچے پھر رہا ہے۔ظالم سکون سے خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔قابلِ تاسف بات یہ ہے کہ معاشرے میں کوئی بھی آسودہ حال نظر نہیں آتا۔آخر سکونِ دل مانگیں تو مانگیں کس سے؟ لوگ تو گرنے والوں کو اور بھی دھکیل دیتے ہیں۔دنیا خود سنگ ریزی پہ تلی ہے مگر مظلوم کو آہ و پکار کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی:

؎دھکیل دیتے ہیں کچھ اور گرنے والوں کو

کسی کے ہاتھ میں اب ہاتھ کون دیتا ہے

؎اچھالتی رہی پتھر میری طرف دنیا

مجھے ہوا کا جھونکا بھی مارنے نہ دیا

مظفر وارثی کہتے ہیں کہ انسانوں کی قدر ذہانت کی بجائے سر پر رکھی ہوئی دستار سے کی جاتی ہے۔معیار کا پیمانہ آج کے معاشرے میں خوبیوں کی بجائے مقدار کو گردانا۔دستار اچھالنے والے کو معزز جبکہ زخم کھانے والا کمتر متصور ہے۔سماجی ناہمواری کی بڑی وجہ آدمیت کا خدا بننا ہی ہے۔

16۔واعظین پہ طنز:

واعظین پہ طنز کرنا اردو شاعری کی روایت رہی ہے۔صوفی طریقت کا پابند ہو کر باطن ستھرا کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، جبکہ واعظِ شریعت کا ہیرو بن کر ظاہری صورت دیکھ کر فتوی کا صدور کرتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر اردو شعراء کی واعظین سے بن نہیں پاتی۔اس کشمکش کی ایک اور بڑی وجہ ملائوں کے اقوال و افعال کا تضاد ہے۔مظفر وارثی اس پہلو کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

؎ہونٹوں پہ آج بھی ہیں اذانیں بہت مگر

سینوں میں احترامِ حرم آج بھی نہیں

ہمارے مبلغین، ناصحین اور واعظین کا روزِ ازل سے یہی وطیرہ رہا ہے کہ انہوں نے امت کو یکجا کرنے کی بجائے ضمنی مسائل میں اس قدر الجھائے رکھا کہ مسلم امہ کی شیرازہ بندی میں ایک حدِ فاصل ہمیشہ کے لئے قائم ہو گئی۔کفار کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کی بجائے اہلِ ایماں کو مسلمان کرنے کی ہر دم کوشش کی جاتی ہے۔ہر فرقہ دوسرے فرقے کے نزدیک کافر ہے اور یوں مسلم امہ کا ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں نقل مکانی کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔لوگ دین کے پیچھے چلنے کی بجائے دین کو اپنے پیچھے چلانے پر مصر ہیں۔لوگ اسلام کا نفاذ تو چاہتے ہیں مگر اپنے اوپر نہیں بلکہ دوسروں پر۔یوں مذہب کی دھڑا بندی رواج پکڑتی جا رہی ہے۔مظفر وارثی دورِ حاضر کے واعظین کے مقصدِ تبلیغ پہ اس انداز میں طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں:

؎حلقہء کفر میں تبلیغ نہیں کی جاتی

اہلِ ایماں کو مسلمان کیا جاتا ہے

ہم مسلمانوں کو دشمنوں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، بلکہ ہم خود اپنی اپنی پیٹھ میں خنجر گھونپنے کے لیے کوشاں ہیں:

؎اپنی اپنی پیٹھ میں آپ ہی خنجر مار رہے ہیں

جھوٹی جیت کے نام پر لوگو ہم سب ہار رہے ہیں

ہر طبقہ اور ہر فرقہ اپنا انفرادی تشخص کو مضبوط بنانے کے لیے دوسرے کو کافر کافر کہہ رہا ہے۔ہم انفرادی شناخت کے حصول کی خاطر اجتماعی شناخت کھو بیٹھے ہیں۔ایک خدا، ایک نبی، ایک دین اور ایک کتاب ہونے کے باوجود بھی ہم اپنا الگ الگ طرزِ عبادت اور نظریہء عبادت رکھتے ہیں۔ایک مذہب سے تعلق ہونے کے باوجود ہماری ذیلی شاخیں مذہب میں تشکیل پا کر اپنے مسلک کی الگ مساجد کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ہم اپنے دین کے ذریعے دوسروں کو راہِ راست پر لگانا تو کجا، خود کو بھی صراطِ مستقیم پر چلا کر مذہبی یگانگت کو فروغ نہ دے سکے۔

17۔تصورِ حسن:

مظفر وارثی کے محبوب کا حسن حدِ برداشت سے بھی ماوراء ہے۔ایسا حسن جس کی آنکھیں بھی تاب نہیں لا سکتیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کے حسن کو اپنے فن کے ذریعے دوام بخشنے

Vol.5 No. 1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کے خواہاں ہیں۔ تاکہ جب تک ان کی شاعری پڑھی جاتی رہے گی اس وقت تک ان کے محبوب کے حسن کی تعریف بھی ہوتی رہے گی:

؎ برداشت کی حدوں سے اگر بڑھ گیا جمال
زنجیرِ احتیاطِ نظر ٹوٹ جائے گی

؎ ادھر آ میں اپنی آنکھیں تیرے جسم پر سجا دوں
میری زد میں حسن تیرا میرے بعد تک رہے گا

اگرچہ انکا محبوب نقاب میں لپٹا ہوا بھی کیوں نہ ہو، ان کا فن اس کے رونمائی کر کے دم لیتا ہے:

؎ نقاب اوڑھ کے آنا ہے تیری مجبوری
میرا ہنر میرا فن رونمائیاں کرنا

18۔ تصورِ عشق:

مظفر وارثی جہاں نعت گو شاعر ہیں وہیں ایک رومانوی شاعر بھی ہیں۔ ان کے معاشقے کا واضح ثبوت ہمیں ان کی آپ بیتی "گئے دنوں کا سراغ" سے واضح ملتا ہے جہاں وہ اپنی زندگی کے پہلے شعر کے رقم کئے جانے کی وجہ اپنی محبوبہ بتاتے ہیں اور وہ شعر یہ تھا:

؎ اے مظفر قول سے اپنے وہ پھر سکتے نہیں
کیونکہ میرے پاس ان کے ہاتھ کی تحریر ہے

مظفر وارثی اپنی عشقیہ روداد کے متعلق اپنی آپ بیتی میں رقم طراز ہیں:

"ابا میاں جی کے ایک دوست اپنی نوعمر صاحبزادی کے ساتھ دس بارہ دن ہمارے مہمان ہوئے۔ تاج دہلی تیلی بلا کی حسین لڑکی تھی۔ رنگ گورا نہیں گندمی تھا۔ تیکھے نقوش۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ لمبے لمبے بال، قیامت کی چال۔ پہلی ہی نظر میں نس نس میں اتر گئی۔۔۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ان دیکھا پل دونوں کے درمیان بن گیا۔ جب بھی نظر میں جا کر اسے تفصیل سے دیکھا، کتاب کے ایک ایک ورق کی طرح ہم پر کھل گئی۔" ۵

مگر زمانے کی ستم ظریفی کہیے یا معاصرانہ چشمک؟ مظفر وارثی کو صرف ایک نعت گو شاعر کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہوئی اور نعت گوئی میں ان کی غزل گوئی دب کے رہ گئی۔ ان کے ہاں رومانوی اثرات ہمیں جابجا ملتے ہیں۔ جیسے ذیل کے اشعار میں رومانس ملاحظہ ہو:

؎ صرف احساس کی آنکھوں سے نظر آؤں گا
کسی جھونکے کی طرح اب تیرے گھر آؤں گا

؎ تو محبت کی زمیں سے مجھے آواز تو دے
آسماں پر بھی ہوا ہیں تو اتر آؤں گا

مظفر وارثی کے نزدیک عشق کا تصور یہ ہے کہ اگر اس میدان میں اترا جائے تو پھر ظرف بڑا ہونا چاہیے۔ محبوب کے ظلم و ستم اور بے رخی پہ شکوہ و شکایت اور واویلا کرنے کی بجائے اسے خوشدلی سے قبول کرنا چاہیے۔ عشق کی ہار، ہار نہیں بلکہ جیت ہوا کرتی ہے:

؎ محبت کا تو پتھر مارنا بھی اچھا لگتا ہے
سہانی صورتوں سے ہارنا بھی اچھا لگتا ہے

؎ دیدہ و دل ہی نہیں جاں بھی نچھاور کر کے
قرض کی طرح محبت نہیں مانگی جاتی

ظلم اور قاتل کے آگے مظفر وارثی ڈٹ کر کھڑے ہوتے ہیں اور ذرا بھی جھکاؤ یا خمداری سے کام نہیں لیتے۔ مگر جہاں عشق کی بات آتی ہے تو اس کی دہلیز پر اپنا سر خم کرنا بھی اپنے لئے اعزاز سے کم نہیں سمجھتے:

؎ کوئے قاتل میں مظفر رہے گردن اونچی
اور سر عشق کی دہلیز پہ خم کرتے چلو

ایک عاشق کی پہلی طلب اپنے محبوب کے دیدار اور اس کی ملاقات سے شرف یاب ہونا ہوتی ہے۔ مگر بعض عشاق کے نزدیک وصل سے زیادہ ہجر کی کیفیت سکون کا باعث ہوتی ہے۔ وصل میں محبوب سے ملنے کے بعد بچھڑنے کا غم جاں سے ملحق ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہجر میں اگرچہ فرقت کے اذیت ناک لحات سے ایک عاشق کا واسطہ پڑتا ہے۔ مگر محبوب سے ملنے کی امید اسے پھر سے شاداب کر دیتی ہے۔ مظفر وارثی کے ہاں بھی عشق میں وصل کی بجائے ہجر کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے:

؎ عشق کو موجِ ساحل راس نہیں آتی
یہ موتی پاتال میں زندہ رہتا ہے

19۔مذہبی موضوعات:

مظفر وارثی کے ہاں متصوفانہ اور اخلاقی موضوعات بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ نیکی و بھلائی کا جابجا درس ملتا ہے۔ ان کی نظم ہو یا غزل، گیت ہو یا قطعات سبھی اصناف میں منفرد موضوعات اور اسلوب کی عکاسی ملتی ہے۔ نبی احمد، مظفر وارثی کی فکر و فن کے متعلق لکھتے ہیں:

"مظفر وارثی نے غزل، نظم، حمد، نعتِ سلام، گیت، قطعات اور ہائیکو میں طبع آزمائی کی ہے۔ جدید اردو غزل میں منفرد اسلوب اور متنوع موضوعات کے باعث اردو غزل میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔"۷

تقویٰ:

یہ تمغہ سینے پہ خود ہی سجانا پڑتا ہے
خدا کا خوف مراعات میں نہیں ملتا

ہدایت کے لیے انسانی کوشش اور قلبی آمادگی کا ہونا ضروری ہے، تبھی رب تعالیٰ اپنے بندے کے انتخاب کے مطابق اسے نیکی کی ہدایت و توفیق بخشتا ہے۔

20۔قناعت پسندی اور متحمل مزاجی:

انسان کو ہر صورت میں قناعت پسندی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا چاہئے۔ قرآنی آیت کا مفہوم ہے کہ قریب ہے کہ تم اپنے لیے اس شئے کا مطالبہ کرو جو تمہارے حق میں بہتر نہ ہو اور ایسی چیز سے گریزاں رہو جو کہ تمہارے حق میں حالانکہ بہتر ہو۔ اس لئے خوشیوں میں شکر اور غم کی صورت میں صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہیے۔ تبھی مظفر وارثی کہتے ہیں:

خوشیاں ملیں تو شکر کی جھولی میں ڈال لیں
اور غم ملے تو صبر کو دامن بنالیا

خدا کا شکر مظفر کہ ہو رہی ہے بسر
نہ شہزادوں کی صورت نہ سادھوؤں کی طرح

21۔تصورِ موت:

زندگی کو مظفر وارثی جنازہ اور برات کا مجموعہ فقط قرار دیتے ہیں:

کچھ جنازے کی کچھ برات کی ہے
بس یہی ملکیت حیات کی ہے

مسافرانِ عدم کو میں جب بھی دیکھتا ہوں
تو دھیان رختِ سفر کی طرف بھی جاتا ہے

22۔خودشناسی:

خدا اور کائنات سے آگہی حاصل کرنے سے قبل خود آگاہی یا خودشناسی ضروری ہے۔ بزرگوں کا قول ہے: من عرفہ نفسہٗ فقد عرف ربہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا گویا اس نے رب کو پہچان لیا۔ اسی لیے مظفر وارثی انسان کے اندر کے جہاں کو تصویر کائنات سے تعبیر کرتے ہیں:

ذات میں ڈوب کر بھی دیکھ لیا
یہ بھی تصویر کائنات کی ہے

فلسفہ وحدت الشہود کو سمجھنے کے لئے اپنے آپ کو سمجھنا ضروری ہے:

عبور کرلوں گا جب میں ہر زاویے سے خود کو
جبھی کچھ اندازہء مقام شہود ہوگا

جب تک انسان خود آگہی حاصل نہیں کرسکے گا، اس وقت اس پر اسرارِ شہنشاہی نہیں کھل سکیں گے۔

23۔تصورِ الہٰ:

خدا کا تصور یا توحید کا تصور نفی و اثبات پر ہے۔ پہلے ہر شے کا انکار اور بعد از ایک خدا کے اقرار کا نام توحید ہے:

وہ مظفر نہیں ہے اور ہے بھی
نفی روحِ رواں ثبات کی ہے

24۔علاماتِ قیامت کا بیاں:

مظفر وارثی کی غزلیات میں قرآنی آیات کے تراجم کے اشارے بھی ملتے ہیں۔ جیسے قرآن مجید کے تیسویں پارے میں موجود سورۃ "انفطار" میں قیامت کی ہولناکیوں اور علامات کا تذکرہ آیا ہے۔ مظفر وارثی اسی مفہوم کو اپنی غزلوں کا موضوع یوں بناتے ہیں:

روئی کی طرح فضاؤں میں اڑیں گے کہسار

Vol.5 No. 1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

خاک ہو جائیں گے بہتے ہوئے دریالو گو

تارے جھڑ جائیں گے گر جائے گا بجھ کر مہتاب

بند ہو جائے گا سورج کا نکلنا لو گو

تہہ کیے جائیں گے افلاک صفوں کی مانند

اور ہو جائے گا شق سینہ زمیں کا لو گو

اسلامی اصطلاحات کا غزل میں انوکھا استعمال:

مظفر وارثی نے غزل گوئی کی صنف میں مذہبی، سماجی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی ہر طرح کا موضوع بیان کیا ہے۔ ایک اور اچھوتا پن جو ان کی غزلیات میں ہمیں ملتا ہے وہ مختلف اسلامی اصطلاحات کا مروج مفاہیم سے ہٹ کر استعمال ہونا ہے۔ جیسے طواف، اعتکاف، زکوۃ و خراج جیسی مختلف اصطلاحات اپنے مخصوص معنی میں مذہب کے ساتھ منسلک ہیں۔ مگر سماجی آلام کے بیانیے میں مظفر وارثی نے انہیں یوں ایک نیا استعاراتی معنی بخشا ہے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

ہم لوگ پر چھائیوں سے ڈرتے ہیں

روشنی کا طواف کون کرے

ہم مظفر ہیں بھیڑ میں تنہا

زحمتِ اعتکاف کون کرے

فنی محاسن:

مظفر وارثی کی غزل میں روایت کی پاسداری بھی۔ بقول سلطانہ سحر:

"تغزل جسے غزل کی جان کہا جاتا ہے، مظفر وارثی کی غزل میں رچا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں تغزل کا روایتی انداز ملتا ہے جو نہ صرف ان کی غزل کی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے، بلکہ ان کی غزل کا تانا روایت سے بھی جوڑ دیتا ہے۔" ے

اور جدید رجحانات کا عنصر بھی۔ کلاسیکی شعراء کی زمین میں لکھی گئیں غزلیات بھی ملتی ہیں جبکہ جدید شعری اصولوں کی پاسداری بھی۔ مثلاً غالب کی دو غزلیات کی زمین میں لکھی گئی غزل کے چند اشعار مظفر وارثی کے ملاحظہ کیجئے:

پھر مجھے دیدہء تر یاد آیا

دل، جگر تشنہ فریاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا (غالبؔ)

دھوپ نکلی تو شجر یاد آیا

نہ ملی چھاؤں تو گھر یاد آیا

تیغ اٹھالی ہے مظفر ہم نے

جب کبھی موقعِ فریاد آیا (مظفر وارثی)

دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں

خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں (غالب)

مانا کہ مشتِ خاک سے بڑھ کر نہیں ہوں میں

لیکن ہوا کے رحم و کرم پر نہیں ہوں میں

رکھتا ہو جو بدلتی ہوئی قدر پر نظر

اس ذہن کی رسائی سے باہر نہیں ہوں میں (مظفر وارثی)

اس کے علاوہ ان کی غزل میں صنائع بدائع کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے۔ جس کا تذکرہ درج ذیل ہے:

1۔ تشبیہ:

تشبیہ سے مراد مشترک خصوصیات کی بناء پر کسی چیز کو کسی دوسری چیز کی مانند قرار دینا ہے۔ مظفر وارثی کے ہاں پوری کی پوری غزلیات بھی تشبیہاتی انداز میں ملتی ہیں۔ جن میں حروفِ تشبیہ کو ردیف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے:

یہ کس نے زخم لگائے ہیں خوشبوؤں کی طرح

بدن سے خون ٹپکتا ہے آنسوؤں کی طرح

Vol.5 No. 1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

؎وہی طلسم اندھیروں کا توڑ سکتے ہیں
جو خود سے لیتے ہیں روشنی جگنوؤں کی طرح

2۔استعارہ:

استعارہ کے لغوی معنی مستعار یا ادھار لینا کے ہیں۔اس میں مشترک صفات کی بنا پر تشبیہ کا کا تعلق پیدا کیے بغیر کسی چیز کو ہو بہو دوسری چیز کا نام دیا جاتا ہے۔ذیل کے اشعار میں استعاراتی فضا ملاحظہ ہو:

؎بوئی جاتی ہیں ہر کھیت میں نفرتیں
پیار کی آبیاری نہیں ہو رہی
؎شعلہ و شبنم کے سنگم کا سفر ہے زندگی
دھوپ کی اپنی حرارت چاندنی اپنی جگہ

پہلے شعر میں کھیت دل کا استعارہ جبکہ دوسرے شعر میں شعلہ غم اور شبنم خوشی کے استعارے کے طور پر مستعمل ہے۔

3۔ تلمیح:

تلمیح میں ایک خاص لفظ لا کر کسی اہم واقعہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ذیل میں پیش کردہ شعر میں سکندر کی وسیع سلطنت اور سقراط کا سچائی کی خاطر موت کی بھینٹ چڑھنے کے واقعات کی طرف مظفر وارثی اپنی غزلوں میں اشارہ کرتے ہیں:

؎خواہش ہوس کے روپ میں اچھی نہیں لگی
دنیا کو فتح کر کے سکندر نہیں گیا
؎کتنے سقراطِ سماعت میری باتیں سنتے
زہر سچائی کا ہونٹوں پہ اگر لے آتا

4۔صنعت ذو قافتین:

یہ ایک ایسی صنعت ہے جس کے ذریعے ایک شعر کے دونوں مصرعوں میں دو دو قوافی کا التزام کر کے شعر میں حسن پیدا کیا جاتا ہے:

؎خوشبو سے ہوا سائے سے دیوار نہ بچھڑے
دل چاہے بچھڑ جائے مگر یار نہ بچھڑے
؎زبانِ حسن میں سب سے کلام کرتا ہے
یہ جائیداد وہ ہر اک کے نام کرتا ہے

پہلے شعر میں سائے، جائے اور دیوار، یار ہم قوافی جب کہ دوسرے شعر میں سے، کے اور سے، کلام اور نام آپس میں ہم قافیہ ہیں۔

5۔صنعت تاکید المدح بمایشبہ الذم:

ایسا شعر جس میں خوبی کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ وہ خامی متصور ہو۔مظفر وارثی ذیل کے شعر میں سچ کی خوبی کو اس طور پر پیش کرتے ہیں کہ زمانے کی نظروں میں وہ برائی شمار ہوتی ہے:

؎سچ کی عادی تھی مظفر کی زباں
اس لئے اس کو برا سمجھا گیا

6۔صنعتِ جمع:

اس میں ایک مصرعے میں چند چیزوں کا ذکر کر کے اسے پھر ایک حکم کے تحت جمع کیا جاتا ہے:

؎کھنکتے سکے ہوں تلوار ہو کہ زنجیریں
میں نغمہ گر کسی جھنکار سے نہیں ڈرتا
؎دیدہ دل ہی نہیں جاں بھی نچھاور کر کے
قرض کی طرح محبت نہیں مانگی جاتی

پہلے شعر میں سکے، تلوار اور زنجیر کا ذکر کر کے ان کی صوتی مناسبت قائم کی گئی ہے جبکہ دوسرے شعر میں مظفر وارثی نے آنکھیں، دل اور جان تینوں کا ذکر کر کے ان پر محبت کو فوقیت دی ہے۔

7۔صنعتِ ترافق:

کسی شعر میں تصور کو اس طور پر پیش کرنا کہ پہلا مصرع پہلے دوسرا بعد میں یا دوسرا پہلے، پہلا بعد میں پڑھا جائے تو اس کے مفہوم میں فرق نہ آئے۔صنعتِ ترافق کہلاتا ہے۔اس کی مثال

Vol.5 No. 1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہمیں مظفر وارثی کے ہاں یوں ملتی ہے:

ے خود سے چراغِ دل نہ بجھا اور دیکھ لے
کرتی ہے کیا سلوک ہوا اور دیکھ لے

ے زندگی کا زخم گہرا تھا مگر اتنا نہ تھا
تجھ سے پہلے بھی میں تنہا تھا مگر اتنا نہ تھا

ان دونوں اشعار میں مصرعے کی ردوبدل کرنے سے اشعار کا مطلب ذرا برابر بھی تبدیل نہیں ہوتا۔

8۔ محاورہ بندی:

دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا ایسا مجموعہ جس میں حقیقی کی بجائے مجازی معنی مراد لئے گئے ہوں محاورہ کہلاتا ہے۔ مظفر وارثی کی غزلیات میں محاورہ بندی ہمیں کثرت سے ملتی ہے:

ے سفید ہو گیا شاید آدمی کا لہو
اجالا بر سر پیکار ہے اجالے سے

ے جن کے ہاتھ مظفر لمبے ہوتے ہیں
کسی کے ہاتھ میں ان کا دامن نہیں ہوتا

لہو کا سفید ہونا اخلاص اور مروت کا ختم ہونا جبکہ لمبے ہاتھ ہونے سے مراد اختیارات کا وسیع ہونا ہے۔

9۔ صنعتِ معکوس:

معکوس عکس سے ہے جس کے معنی الٹنا کے ہیں۔ شعر کے پہلے مصرعہ میں پیش کردہ تصور کو دوسرے مصرع میں اس کے تضاد میں لے آنا صنعتِ معکوس کہلاتی ہے:

ے یار تو سب ہی مظفر میرے دشمن نکلے
دشمنوں میں میرے کیا کوئی میرا یار بھی ہے

ے وجود سے جب نکل رہی ہیں عدم کی راہیں
عدم میں بھی پھر کوئی جہانِ وجود ہو گا

10۔ کنایہ:

کنایہ کے معنی اشارہ کرنا کے ہیں۔ کسی شعر میں تصور کی وضاحت کیے بغیر ایک لفظ لا کر اس کی پیش کرنا کنایہ ہے۔ کنایا میں حقیقی کی بجائے مجازی معنی مراد ہوتے ہیں:

ے دنیا بھی تو ایک لفظ کا صدقہ ہے مظفرؔ
لفظوں سے کبھی اپنے قلم کار نہ بچھڑے

اس شعر میں لفظ کا کنایہ قرآن کی اس آیت کی طرف ہے۔ انما امره اذا اراد شيا طين يقول لہ كن فيكون مفہوم آیت: جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ مظفر وارثی یہاں لفظ کا کنایہ تخلیق کائنات کے لفظ "کن" کے طور پر مراد لیتے ہیں۔

11۔ صنعتِ مبالغہ:

کسی شئے یا خیال کو شعر میں بڑھا چڑھا کر بیان کرنا صنعت مبالغہ کہلاتی ہے:

ے دل شکستہ نہ رو بار بار چپ ہو جا
چھری سے تیز ہے اشکوں کی دھار چپ ہو جا

ے میرے آنسو خاک میں ملتے گئے
آسماں پر کہکشاں بنتی گئی

مظفر وارثی کے درج بالا دونوں اشعار میں اشکوں کی دھار کا چھری کی دھار سے تیز ہونا اور مٹی میں آنسو ملنے سے آسمان پر کہکشاں بننا، صنعت مبالغہ کہ کی نادر ترین مثالیں ہیں۔

12۔ صنعتِ تعلی:

شاعر کا اپنے آپ اپنی سخنوری کی تعریف کرنا صنعت تعلی ہے:

ے رہوں گا زندہ میں اپنی تخلیق میں مظفرؔ
میرے ہر اک لفظ میں پیام نمود ہو گا

ے یوں ہی گونجتا رہوں گا میں گلی گلی مظفر
میرا شہر شہر پھیرا میرے بعد تک رہے گا

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

13۔ سہلِ ممتنع:

سہل کے معنی آسان جبکہ ممتنع کے معنی مشکل کے ہیں۔ کسی شعر کی ایسی پیشکش جو دیکھنے میں تو بہت آسان ہو مگر اس جیسا شعر کہنا مشکل ہو، سہل ممتنع کے زمرے میں آتا ہے۔ مظفر وارثی کے ہاں یہ سادہ بیانی اچھوتے انداز میں ہمیں جابجا ملتی ہے۔ چھوٹی اور سادہ سی بحر میں بڑی فکر کو پیش کر جاتے ہیں :

؎ چاہنے والے معذرت چاہیں
پیار کا کتنا کال ہے بابا

؎ میں حقائق کے لیے لڑتا رہا
زندگی اک داستاں بنتی گئی

14۔ صنعتِ مراۃ النظیر:

اس صنعت کے تحت ایک ہی شعر میں ایک ہی قبیل کی اشیاء کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر پہلے مصرعے میں سمندر کا ذکر ہے تو ساتھ ہی ناؤ، ساحل، موج اور طغیانی وغیرہ کا بھی بیانیہ ہو۔ باغ کا ذکر ہے تو ساتھ درخت، پھول اور خوشبو کا ذکر کرنا وغیرہ:

؎ چور اپنے گھروں میں تو نہیں نقب لگاتے
اپنی ہی کمائی کو تو لوٹا نہیں جاتا

؎ طوفان میں ہو ناؤ تو کچھ صبر بھی آ جائے
ساحل پہ کھڑے ہو کے تو ڈوبا نہیں جاتا

مظفر وارثی پہلے شعر میں گھر، نقب کا ذکر کر کے اسی مناسبت کے دوسرے الفاظ مثلاً کمائی اور اس کے لوٹنے کا ذکر کرتے ہیں۔ دوسرے شعر میں طوفان، کشتی، ساحل اور ڈوبنے کا ذکر ایک ہی قبیل کے تحت کرتے ہیں۔

15۔ صنعت تضاد:

تضاد سے مراد الٹ کے ہیں۔ ایک مصرعے میں پیش کردہ چیزوں کے بالکل مخالف دوسرے مصرعے میں چیزوں کے ذکر کرنے کا نام صنعت تضاد ہے:

؎ تو محبت کی زمین سے مجھے آواز تو دے
آسماں پر بھی ہوا میں تو اتر آؤں گا

؎ ہمارے دن بھی اندھیروں میں قید رہتے ہیں
ہمیں چمکتی ہوئی رات کون دیتا ہے

پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں زمین کا ذکر ہے تو دوسرے مصرع میں آسمان کا۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں دن کا ذکر ہے تو دوسرے مصرعے میں اس سے الٹ رات کا ذکر کیا گیا ہے۔

16۔ صنعت تعجب:

شعر میں کسی تصور کی پیشکش کرتے ہوئے حیرانی اور تعجب کا اظہار کرنا صنعت تعجب ہے:

؎ حیرتیں جم گئیں آنکھ میں
زندگی کیا سے کیا ہو گئی

17۔ صنعت استفہام:

استفہام کے معنی سوال اٹھانا کے ہیں مظفر وارثی اپنی غزلوں میں کبھی مروج نظام جبکہ کبھی انسانیت پر سوال اٹھاتے نظر آتے ہیں:

؎ کس قدر سکون سے کھیلتے ہیں خون سے ؟
ظالموں کی زندگی میتوں سے پٹ گئی

؎ ہر ایک سے آخر کیوں میں دادِ ہنر چاہوں؟
لازم تو نہیں مجھ پر جاہل سے سند لینا

18۔ صنعت قطار البعیر:

اس فن کے تحت پہلے مصرع کے آخری لفظ سے دوسرے مصرعے کا آغاز کیا جاتا ہے۔ جیسے ذیل کے شعر میں مظفر وارثی پہلے شعر کا پہلا مصرع قہقہہ کے لفظ پر ختم کر کے دوسرے مصرعے کو قہقہے ہی کے لفظ سے شروع کرتے ہیں:

؎ کتنی معصومیت سے لگاتے رہے ہم حسیں قہقہے
قہقہوں کے نتیجے میں رونا ہی تھا یہ تو ہونا ہی تھا

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

؎حسن کا منظر آئینہ
آئینے کو نظر کی تلاش

19۔ صنعتِ تکرار:

شعر میں الفاظ کی تکرار کے ذریعے شعر میں ترنم و موسیقیت پیدا کرنے کا نام صنعت تکرار ہے:

؎آئینے اپنی جگہ، بے چہرگی اپنی جگہ
دل میں دنیا کے بنائے ہر کوئی اپنی جگہ

؎دوست کا دوست ہو سکتا ہے دوست مگر
دشمن کا دشمن بھی دشمن نہیں ہوتا

20۔ صنعتِ ندائیہ و خطابیہ:

ندا کے معنی پکار یا آواز کے ہیں۔ شعر میں ندائی اور خطابیہ لب و لہجہ اپنانا صنعتِ ندائیہ ہے:

؎اے میرے دیس کے دردمندو کہو
کیا دکھی قوم ساری نہیں ہو رہی

؎اے ٹوٹتے ستارو میرا دل نہ توڑنا
ٹوٹا جو دل امیدِ سحر ٹوٹ جائے گی

21۔ حسن تعلیل:

حسن کے معنی خوبصورتی جبکہ تعلیل لفظ علت سے ہے۔ جس کے معنی وجہ کے ہیں۔ کسی امر کے وقوع پذیر ہونے کی وجہ بیان کرنا جو حقیقت میں ویسی نہ ہو جیسا بیان کیا جا رہا ہے۔ مگر اس کا حسین اندازِ بیاں اسے حقیقت کا لباس پہنا دے، صنعت حسن تعلیل کہلائے گی:

؎جینے کے واسطے تو ضروری ہیں حادثے
لہروں کے ناچنے کو بھنور مت کہا کرو

؎دیکھ کے اپنا خون شفق کے ہاتھوں پر
اکثر میری آنکھ بھر آئی شام کے بعد

پہلے شعر میں لہروں کا طغیانی کی وجہ سے اٹھنے کو ناچنے سے تعبیر کیا گیا ہے جبکہ دوسرے شعر میں مظفر وارثی شفق یعنی طلوع آفتاب سے قبل آسمان پر ظاہر ہونے والی سرخی کو اپنے خون سے تعبیر کرتے ہیں۔

22۔ تجسیم نگاری:

مجرد اشیاء کو مجسم پیش کرنے کا نام تجسیم نگاری ہے۔ مظفر وارثی اپنے نظریات اور خیالات کو اس طور پر پیش کرتے ہیں کہ بے جان چیزوں کو بھی جسم و جاں بخش کر کے انہیں متحرک دکھاتے ہیں۔ ذیل کے شعر میں ہوا کا خفیہ بازو تجسیم کی بہترین مثال ہے:

؎اسی نے نوچ لئے ہوں گے پھول پھل سارے
ہوا کا بازوئے خفیہ شجر تک آیا تھا

؎زلزلوں نے اپنے ہاتھوں سے میری تعمیر کی
منتشر ہو کر بھی ہر چیز تھی اپنی جگہ

؎طائرِ آرزو کو زمانہ ہوا
وقت کے بوڑھے برگد پہ بیٹھے ہوئے

مظفر وارثی کے ہاں چھوٹی اور بڑی دونوں بحروں میں اشعار ملتے ہیں:

چھوٹی بحر کا استعمال:

؎دل کی دھڑکن سزا ہو گئی
ظلم کی انتہا ہو گئی

بڑی بحر:

؎ٹوٹ جانا تھا دل اک کھلونا ہی تھا، یہ تو ہونا ہی تھا
درد کی سیج پر ہم کو سونا ہی تھا، یہ تو ہونا ہی تھا

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

رئیس امروہی، مظفر وارثی کے غزلیاتی اسلوبِ بیاں کے متعلق رقمطراز ہیں:

> ”کوئی شبہ نہیں کہ مظفر وارثی نے غزل میں بھی اپنا لہجہ الگ متعین کر لیا ہے۔ اور یہ اتنی بڑی بات ہے جس طرح اس کائناتِ لا محدود میں کسی نئے کہکشانی نظام کی دریافت۔۔۔ غزل کے الفاظ و تراکیب صدیوں سے متعین ہیں۔ ان استعارات و اسالیب میں تغزل کا نیا رخ پیدا کرنا کوئی آسان مرحلہ نہیں، مگر شاعر نے اس مرحلے کو آسان کر دیا ہے۔“[۸]

ہجرت کے بعد لکھنے والے شعراء کی صف میں مظفر وارثی ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ہر غزل ان کے منفرد لب و لہجے کی ترجمان ہے۔ جس طرح انہوں نے نعت گوئی میں اپنا ایک منفرد مقام و مرتبہ پیدا کیا، اسی طرح انہوں نے غزل گوئی کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوانے کی بھرپور سعی کی۔ اپنی شاعری میں انہوں نے کھل کر سماج کی نمائندگی کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد سعید اللہ صدیق، بحوالہ: مظفر وارثی، کھلے دریچے بند ہوا، لاہور: القمر انٹرپرائزرز، ۱۹۹۳ء، طبع اول

۲۔ مظفر وارثی، گئے دنوں کا سراغ، لاہور: القمر انٹرپرائزرز، ۱۹۹۶ء، ص:۵۶

۳۔ شہزاد احمد، بحوالہ: مظفر وارثی اور ان کی شاعری، رضیہ سلطانہ سحر، لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۱۹۹۹ء، ص:۱۴۶

۴۔ رئیس امروہی، بحوالہ: ایضاً، ص:۱۷۱

۵۔ گئے دنوں کا سراغ، ص:۵۲

۶۔ نبی احمد، اردو غزل میں ہجرت کا تجربہ، اسلام آباد: وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی، س۔ن، ص:۱۱۳

۷۔ مظفر وارثی اور ان کی شاعری، ص:۱۶۵

۸۔ رئیس امروہی، بحوالہ: مظفر وارثی اور ان کی شاعری، ص:۱۷۱